# شاہ ولی اللہؒ کی ایک نمایاں خصوصیت۔ تطبیق

سیدہ ھنا

یوں تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے اور قدرت کی جانب سے بہترین دل و دماغ اور فہم و بصیرت لے کر آئے تھے۔ اور ان صلاحیتوں سے کام لے کر آپ نے دین و ملت کی جو جلیل القدر خدمات انجام دیں، اُن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ آپ کی تصانیف بے شمار ہیں اور تقریباً ہر موضوع پر ہیں۔ آپ کی تعلیمات اور تفہیمات کا دائرہ نوعِ انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ ہر موضوع پر آپ نے ان گنت عقلی و نقلی شواہد فراہم کئے ہیں اور جس مسئلہ کو لیا ہے اس کے افہام و تفہیم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ آپ کی تصنیف فیوض الحرمین سے یہ اندازہ بہ خوبی ہو سکتا ہے کہ کس طرح مشیئت نے آپ کو مسلمانوں کی اصلاحِ حال پر مامور فرمایا۔ اور یہ اسی تائیدِ الٰہی کا فیض تھا، جس نے آپ کو اس قدر وسعت نظر بخشی۔ یہ وسعت نظر شاہ صاحبؒ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جس سے کام لے کر آپ نے کئی مختلف فیہ مسائل اور متصادم گروہوں کے درمیان تطبیق اور اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔

مثال کے طور پر مسئلہ نسخ کو لیجئے، یہ ایک مسئلہ تھا جس کے حل کرنے میں علماءِ کرام

صدیوں سرگرداں رہے اور منسوخ آیات کا شمار بڑھتے بڑھتے پانچ سو تک پہنچ گیا[1]۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے منسوخ آیات کی روز افزوں تعداد سے گھبرا کر اور عام مسلمانوں کی عملی زندگی پر اس کے جو غلط اثرات پڑ رہے تھے، اُن سے پریشان ہو کر بڑی تنقیح و تحقیق کے بعد منسوخ آیات کی تعداد گھٹا کر صرف انیس[19] رہنے دی۔ لیکن بات پھر بھی نہیں بنی کیونکہ قرآن حکیم میں نسخ تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر آیات اور احکامات کو دوسری آیات و احکامات کے ذریعہ منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آخر کار شاہ صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی عمدگی سے یہ بات ثابت کر دی کہ قرآن کریم میں نسخ سرے سے ہے ہی نہیں۔ گو مصلحت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا یہ نظریہ آپ نے فی الوقت واضح نہیں کیا۔ آپ کے سب سے بڑے شارح مولانا عبید اللہ سندھی نے آپ کے ارشادات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات صاف کر دی کہ آپ قرآن حکیم میں نسخ کے قائل نہ تھے کیونکہ جن پانچ آیتوں میں آپ نسخ تسلیم کرتے ہیں، اگر آپ کے طریقے کے مطابق اُن کی تفسیر و تاویل کی جائے تو اُن کا حل بھی کچھ ایسا دشوار نہیں[2]۔ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے ایک آیت کریمہ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ کی تاویل خود مولانا سندھی کا ذاتی تجربہ ہے جس کی رُو سے اُن کے لئے اپنی غیر مسلم والدہ کے حق میں وصیت کرنے کی ایک صورت نکل آئی۔ فرماتے ہیں۔ گو مندرجہ بالا مثال میں ایک عمومی اور مطلق حکم کو خصوصی حالات کے تحت مقید کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور اب میں اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا[3]۔ مولانا سندھیؒ کے بیان کے مطابق باقی چار آیات کی تطبیق بھی نہایت آسان ہے۔ وہ یوں کہ یا تو ناسخ آیت کو اَولیٰ اور بہتر کے حکم کے ماتحت سمجھیں اور منسوخ کو غیر اَولیٰ کے تحت رکھیں۔ یا یہ کہ ایک عزیمت پر دلالت کرتی ہے دوسری رخصت پر[4]۔

---

[1] سیوطی۔ الاتقان۔ [2] مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۷ تا ۷۷۔
[3] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۷ تا ۷۷۔
[4] شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص۷ تا ۷۷۔

غرض نسخ شاہ صاحب کے نزدیک ایک اجتہادی امر تھا اور وہ اس میں متاخرین کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

وفیھا اختلافھم فی النسخ والحق عندی ان ذٰلک باجتھاد واستنباط[1]۔

اور فرماتے ہیں۔ صحابہ وتابعین نسخ را استعمال می کردند بغیر معنی کہ مصطلح اصولیان است وایں باب واسع است وعقل را درآنجا جولانی ہست واختلاف راگنجائش[2]۔

اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ آیۃ ما ننسخ من اٰیۃ . . . خود کلام پاک کے نسخ پر دلالت کرتی ہے تو یہ بات فہم سے بالا ہوگی اور مسئلہ کو جتنا سلجھائیں گے وہ اور الجھتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ پچھلی کتب سماوی کے بعض احکامات کے بارے میں ہے تو پھر بات بالکل آسان ہوجاتی ہے اور گتھی خود بخود سلجھ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود پر اونٹ کا دودھ اور گوشت حرام کر دیا گیا تھا۔ جب کہ شریعت اسلامیہ میں یہ جائز اور مباح ہے۔ یا جس طرح اُن پر یوم سبت کی حرمت فرض کی گئی تھی جب کہ اسلام میں یوم جمعہ کو فضیلت بخشی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے واشگاف الفاظ میں نسخ سے انکار کیوں نہیں کیا۔ یا رائے عامہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ نظریہ کیوں نہیں قائم کیا کہ یہاں نسخ سے مراد دراصل پچھلی کتب سماویہ کے بعض احکامات ہیں۔ تو جن اصحاب نے شاہ صاحبؒ کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ شاہ صاحب دینی اور قومی مصالح کا لحاظ رکھنا ازبس ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ لحاظ اصلاحی کام کا ایک لابدی جزو ہے۔ ارتفاقات میں رواسم کے باب میں انہوں نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ جب نئی شریعت آتی ہے، وہ پچھلے رسوم و رواج اور عقائد کو یکسر محو و نابود نہیں کردیتی بلکہ اُن کا جائزہ لے کر ان میں جو مثبت قسم کے رجحانات ہوتے ہیں، اُن کو جوں کا توں رہنے دیتی ہے اور جو منفی قسم کے رسوم اور رجحانات ہوتے ہیں، اُن کو پوری شدت اور طاقت سے نیست و نابود کر دیتی ہے اور جو رسوم و رواج مثبت اور منفی رجحانات کے بین بین ہوتے

---

[1] التفہیمات الٰہیہ جلد ۲ صـ۱۷۳۔
[2] الفوز الکبیر صـ۳۷۔

ہیں، اُن کے منفی جزو کی اصلاح کرکے اُنہیں قائم رکھتی ہے۔ یہی طریقہ انبیاء کرام کا رہا ہے خود قرآنِ حکیم میں بھی اس حکمت عملی سے کام لیا گیا ہے۔ حرمتِ خمر کے احکامات اس حکمت کی بیّن مثال ہیں۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ إِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا۔ پھر رفتہ رفتہ جب قوم کا مزاج ایک خاص ترکیب کے مطابق تیار ہو جاتا ہے اور بہیمیت پر ملکیت غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو صاف طور پر روک دیا جاتا ہے:۔

"يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝"

ہر وہ شخص جو خلوص دل سے قوم کی اصلاح کرنی چاہتا ہے، اسے یہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیئے تاکہ دینِ حق زیادہ سے زیادہ پھیل سکے۔ اور لوگوں کے دل اُسے آسانی کے ساتھ قبول کرنے پر مائل ہو جائیں۔ ورنہ ان کی تمام تر رسوم و عقائد کو اک دم غلط کہنے کا نفسیاتی طور پر ایک اثر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بددل ہو کر ایک سرے سے داعی کی بات ہی سننے سے انکار کر دیں اور اس طرح اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں۔ نسخ کے باب میں شاہ صاحبؒ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور جو کچھ وہ مصلحتِ وقت کے پیش نظر صاف طور پر نہ کہہ سکے وہ اُن کے بعد آنے والوں نے سمجھا دیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ کو حنفی طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ کیونکہ جس ملک کے لوگوں میں وہ اصلاحی کام پر مامور ہوئے تھے، اُن کی اکثریت فقہِ حنفی کی پیرو تھی۔ یہی معاملہ تفضیل شیخین کے بارے میں پیش آتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فطرۃً حضرت علیؓ کی تفضیل کی طرف مائل ہیں لیکن اُنہیں ہدایت کی جاتی ہے وہ اس طبعی رجحان سے متاثر نہ ہوں[1]۔ پس اسی طرح نسخ کے باب میں انہوں نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے تطبیق کی راہ سجھا دی اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا تاکہ بعد میں آنے والے اہل بصیرت کے ذریعہ بات رفتہ رفتہ واضح ہو جائے۔

آیات قرآنی کے بعد احادیث کا مسئلہ آتا ہے۔ یہاں بھی بعض احادیث ناسخ ہیں۔

---

[1] فیوض الحرمین۔ مشہد ص ۳۳

بعض منسوخ۔ ابن خلدون کے نزدیک ناسخ و منسوخ کی بحث علمِ حدیث کا اہم ترین اور صعب ترین حصّہ ہے۔ اور امام زہری کا کہنا ہے کہ جس تحقیق نے فقہاء کو تھکایا، اور عاجز کیا وہ یہ ہے کہ آنحضرت کی احادیث میں ناسخ کون سی حدیث ہے اور منسوخ کون سی۔[1] شاہ صاحب نے یہاں بھی اپنی غیر معمولی فہم و بصیرت سے کام لے کر مختلف احادیث میں فنکارانہ مہارت اور خوش اسلوبی سے تطبیق فرمائی ہے۔[2] شاہ صاحب کی تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جس تحقیق نے فقہاء کو تھکایا اور عاجز کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے کس خوبی سے اسے سلجھایا۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی وہ حدیث کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے ملک پر حملہ آور ہوگا وہ مغفور ہے۔[3] اور اس لشکر کا سپہ سالار یزید بن معاویہ تھا۔ اب حضورؐ کے اس فرمان اور یزید کی بداعمالیوں کی سزا کے متعلق حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی کے درمیان تضاد واقع ہو گیا۔ مذکورہ حدیث کو صحیح ماننے کی صورت میں (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں) یزید کو یقینی طور پر جنت کا مستحق ماننا پڑتا ہے اور اگر اس کی بداعمالیوں کے باعث جن کی تاریخ گواہ ہے) اور حضورؐ کے ان ارشادات کی روشنی میں اس کو دوزخی یا گنہگار قرار دیتے ہیں تو لازمی طور پر حدیث کا انکار لازم آتا ہے۔ مدتوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا اس پر خوب خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں لیکن حل کوئی نہ پیش کر سکا۔ آخر شاہ صاحبؒ نے مسئلۂ زیر بحث کو بڑی خوبی سے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ جہاد ماضی کے گناہ دھوتا ہے۔ مستقبل کے گناہوں یا اعمالوں کو محو نہیں کرتا۔ یزید سے بعد میں جو گناہ سرزد ہوئے، ان کا حساب کتاب اور جزا و سزا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو انھیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔[4]

اس طرز پر ناسخ و منسوخ احادیث کے بارے میں شاہ صاحبؒ کے تمام کام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، اس میں بھی مختلف مکاتیبِ فکر سے وابستہ لوگوں کے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون۔ اردو ترجمہ ص ۴۶۳

[2] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۶۸۔ [3] صحیح بخاری۔

[4] شرح تراجم ابواب صحیح بخاری ص ۹۶۔

تعصب اور تنگ نظری نے اپنا رنگ جما رکھا تھا۔ ابتداءً یہ صرف مکاتبِ فکر تھے جن میں اختلاف رائے کم اور اتفاق رائے زیادہ پایا جاتا تھا۔ فقہ کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے کہ امام شافعیؒ نے فقہ حنفی میں امام محمد اور مالکی فقہ میں خود امام مالک سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور ایسا کرنے میں کسی قسم کی عار تصور نہیں کی تھی۔ اسی طرح اُس زمانے میں ایک فقہ کے پیرو اکثر دوسرے مکاتبِ فکر سے اکتسابِ فیض کرتے رہتے تھے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حنفی فقہ ہو یا شافعی فقہ۔ مالکی فقہ ہو یا حنبلی فقہ ان کا اصل منبع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی ہے۔ ایک ہی چمن ہے جس سے سب نے خوشہ چینی کی ہے۔ ایک ہی سرچشمہ ہے جس سے چند نہریں نکل کر مختلف اطراف میں بہہ رہی ہیں۔ لہٰذا ان میں اختلاف اگر پایا بھی جائے گا تو وہ فروعی ہوگا نہ کہ اصولی۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تنگ نظری اور تعصب بڑھتا گیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا تھا۔ لوگوں نے اس معاملہ میں اس قدر غلو کیا کہ وہ تحریکیں جو صرف مکاتب فکر یا مسلک کی حیثیت رکھتی تھیں، رفتہ رفتہ مذاہب کی شکل اختیار کرگئیں اور اُن کے پیروؤں نے ایک مسلک کو دوسرے مسلک کے مقابلے میں یوں پیش کیا جیسے ایک شریعت کو دوسری شریعت کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس صورت حال کو بہت محسوس کیا۔ یہ بھی ایک تقدیری امر تھا کہ شاہ صاحب کے والد اور چچا فقہ حنفی کے پیرو تھے، جب کہ ان کے بعض اساتذہ فقہ شافعی سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں ان کی اثر پذیر طبیعت کی تربیت ہوئی۔ آپ نے واضح الفاظ میں یہ حقیقت جتلادی کہ عامۃ المسلمین کی صلاح و فلاح کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ وہ چاروں مذاہب کی اقتدا کریں۔ یہی نہیں بلکہ ایک مکاشفہ میں جب آپ حضور نبی کریمؐ سے ان مذاہب اربعہ کے بارے میں دریافت فرماتے ہیں تو جواب ملتا ہے ان المذاھب والطرق کلھا سواء لافضل لواحد علی الاخر۔

اسلام کی روح کو اگر سمجھا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ جو دین، دین فطرت کہلاتا ہے اور جو اپنے سے پہلے بانیانِ مذاہب کی عظمت کا واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے اور اس کے پیرو اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ لانفرق بین احد منھم الخ۔ وہ بھلا ایک ہی شجر مبارکہ کے خوشہ چینوں اور ایک ہی منبعِ علم سے چمنِ ملت کی آبیاری کرنے والوں میں کیسے تفریق کر سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ اس اختلاف کو مٹانے اور

ان مذاہب کے پیروؤں کو باہم متفق کرنے کے بڑے آرزومند تھے۔ مسلک حنفی اور اُس کے بعد دوسرے درجے پر مسلک شافعی کی مقبولیت دیکھ کر آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ دونوں مسلک مقبولیت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں اور ملاء اعلیٰ کا مقصود بھی یہی ہے کہ ان دونوں مذاہب کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور امام مالک کی عظیم الشان تصنیف کو اس سلسلہ میں حکم بنایا جائے[1]۔ یہ موطا وہی ہے جس کے متعلق امام شافعیؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے بعد صحت و درستگی میں امام مالک کی کتاب موطا سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں"۔

شاہ صاحبؒ نے اپنے مسلک کے پیروؤں کے لئے حنفی فقہ کے ساتھ شافعی فقہ کا مطالعہ بھی لازمی قرار دیا[2]۔ اور مجازاً ان کے متعلق کہا جاتا ہے انہ حنفی عملاً وحنفی وشافعی تعلیماً[3]۔ اور ایک موقع پر خود کو الشافعی درساً[4] بھی فرمایا۔ شاہ صاحبؒ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان اُمور کو اختیار کیا جائے جو سنتِ رسول سے قریب ہیں۔ باہمی اختلافات دور کرنے کی یہی ایک احسن صورت ہے۔ چنانچہ سنت اور فقہ حنفی کی تطبیق کے سوال پر فرماتے ہیں۔ "مجھ پر ایک ایسا مثالی طریقہ منکشف ہوا ہے جس سے مجھے سنت اور فقہ حنفی میں تطبیق دینے کی کیفیت معلوم ہوئی۔ وہ اس طرح کہ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ میں سے جس کا قول سنت سے قریب ہو میں اس قول کو اختیار کروں[5]"۔

موطا کو حکم بنانے میں بھی یہی حکمت پوشیدہ ہے کیونکہ اس میں درج شدہ احادیث زیادہ تر ان صحابۂ کرام سے منقول ہیں جنہوں نے نبی کریمؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپؐ کے ارشاداتِ گرامی اپنے کانوں سے سنے تھے، اور خود ان کی زندگیاں اسی اُسوۂ حسنہ کا نمونہ تھیں۔ سنت سے اس قدر قریب پہنچ کر گروہی اختلافات باقی نہیں رہ سکتے اور یہی شاہ صاحبؒ کی تعلیمات کا حقیقی منشا تھا۔

---

[1] التفہیمات جلد اول ص ۲۱۱-۲۱۲ [2] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۷۹-۸۰
[3]، [4] الہام الرحمٰن ص ۲۳۲۔
[5] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۸۰۔

تصوف کے معاملے میں بھی شاہ صاحبؒ نے یہی طریق کار اختیار کیا اُن کا زمانہ مسلم معاشرے کا دورِ انحطاط تھا۔ تصوف کی آڑ میں شعبدہ بازی ہو رہی تھی۔ نام نہاد پیروں اور صوفیوں کی گرم بازاری تھی۔ کراماتوں اور خوارق کی بھرمار تھی۔ شاہ صاحب نے اس صورت حال سے لوگوں کو خبردار کیا۔ فرماتے ہیں :-

زمانے کا رنگ بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ بہت مکدر ہوگیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔ ایک بے حیا صوفی سے جو رفعِ تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے، اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا[1]۔ اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہئے اور کبھی اُن کا مرید نہ ہونا چاہیئے، کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات اور رسومات میں مبتلا ہیں۔ شہرت، رجوعِ خلق، مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیئے اور نہ ہی ان کی کرامتوں سے دھوکا کھانا چاہیئے۔ عوام کا رجحان اور غلو رسم و رواج کی بناء پر ہوتا ہے اور رسمی امور کبھی قابلِ اعتبار نہیں ہوا کرتے۔ آج کے کرامت پرستوں نے عام طور پر طلسمات اور شعبدہ بازی کو کرامت سمجھ رکھا ہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ انہیں شعبدہ بازیوں کو وہ کرامت کہہ کر مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دل کا حال بتا دیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات معلوم ہو جائیں اور یہ امر بہت آسان ہے[2]۔

غور کرنے کی بات ہے۔ کہاں تصوف اور کہاں شعبدہ بازی، طلسمات اور پیشین گوئیاں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مسلم قوم عملی طور پر سرگرم نہیں رہی تھی۔ جہد للبقاء کا جذبہ سینوں میں سرد پڑ گیا تھا، ذہنوں میں شکست خوردگی کا رنگ پختہ ہو گیا تھا اور وہ قوم جو کسی زمانے میں بقولِ علامہ شبلی نعمانی

وہ قوم جو جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے — گل کر دیئے تھے چراغ جس نے

---

[1]، [2] الرحیم نومبر ۶۶ء۔

روما کے دھوئیں اڑا دیئے تھے اٹلی کو کنویں جھکا دیئے تھے[1]

اور جس قوم کی علمی سرگرمیوں اور ترقیوں کا یہ عالم تھا:-

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی پڑی چار سُو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور چمک دُور دُور اس کی پہنچی جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خُدا کی[2]

اس قوم کی بے عملی کا اب یہ عالم تھا کہ اہلِ ثروت طبقہ بٹیر بازی، کبوتر بازی اور اسی قسم کی دوسری بازیوں میں مصروف تھا۔ اور صوفیہ کا طبقہ خانقاہوں اور تکیوں میں ذکر و فکر اور مراقبہ اور مکاشفہ میں مصروف تھا۔ یہ حالت سراسر جہادِ زندگانی سے فرار کے مترادف تھی اور لطف یہ کہ یہ لوگ اپنی طاعات وعبادات پر نازاں بھی تھے۔ اور تصوف کا وہ چشمۂ صافی جس کا منبع خود حضورِ انورؐ کی ذاتِ گرامی اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کی عملی زندگیاں تھیں، عرب سے نکل کر ایران میں آیا تو ایرانی ویونانی فلسفہ نے اسے گدلا کیا۔ اور جب ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تو بدھ ازم اور ویدانتا کے چشموں میں مل کر غلط راستوں پر بہہ نکلا۔ اور مسلمانوں کا ایک کثیر گروہ ترکِ دنیا کر کے ہمہ تن طاعات وعبادات میں مصروف ہوگیا۔ جذبۂ جہاد قناعت کے جذبے سے بدل گیا، اور پیکرِ تسلیم و رضا بن کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا سب سے بڑی عبادت تصور کی گئی۔ اور اسے تصوف یا معرفتِ الٰہی کا نام دیا گیا۔ شاہ صاحب نے اس صورتِ حال کی طرف توجہ فرمائی اور اصلاحِ حال کی پوری پوری سعی کی۔

اپنی مشہور عالم تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں تحصیل سعادت کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں تحصیلِ سعادت کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ بہیمیت کو بالکل نیست ونابود کر دیا جائے۔ اس طرح کہ دنیا اور امورِ دنیا سے مکمل بے رغبتی پیدا ہو جائے اور اپنی تمام تر توجہ عالمِ جبروت کی

---

[1] مثنوی صبح امید۔
[2] مسدس۔ مدو جزرِ اسلام۔

طرف منعطف کر لی جائے جیساکہ اشراقیین اور صوفیا میں سے مجذوبوں کا طریقہ رہا ہے۔
اس طریق میں تین بڑی خرابیاں ہیں ۔
(۱) ایسے لوگ دنیا میں بہت کم تعداد میں ہیں ۔
(۲) اس میں سخت ترین ریاضتیں، کامل ترین یکسوئی ، اور سب سے بڑھ کر ترکِ معاش کا مرحلہ آتا ہے جس کی سرحدیں بدھ ازم اور ویدانتا سے جا ملتی ہیں ۔
(۳) ایسے لوگوں کا دعوتِ الٰہی کے مبلغین اور مصلحین فی الارض میں شمار نہیں ہوتا ۔
نتیجہ یہ نکلا کہ یہ طریقہ مقصدِ تخلیق کو پورا نہیں کرتا ۔ اور اگر اکثر لوگ اس طریقے کو اختیار کرلیں تو دنیا برباد ہو کر رہ جائے ۔

تحصیلِ سعادت کا دوسرا طریقہ وہ ہے کہ قوتِ بہیمیہ کی اصلاح کی جائے اور اُس کی کجی دور کرکے اسے قوتِ ملکیہ کے تابع کر دیا جائے ۔ انبیاءِ کرام اسی دوسرے طریقے کو قائم کرنے کے لئے تشریف لائے ۔ اور اسی طریقے کے پیشوا مفہمین اور اربابِ اصلاح کہلاتے ہیں اور یہی لوگ دین و دنیا کی ریاست اور منصبِ امامت کے مالک ہوتے ہیں[1]۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام کا کردار اسی طریقے کا مظہر تھا ۔ عبادات میں صوفیائے کرام جیسی محویت اور استغراق ، دنیوی امور میں درستگی اور اصلاح ، اعلائے کلمۃ الحق میں سرگرمی اور جوش ، صلۂ رحمی ، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی ۔ حدیثِ قدسی انما الاعمال بالنیات کی روشنی میں اگر دیکھئے تو اُن کا مرنا جینا ، سونا جاگنا ، چلنا پھرنا ، اٹھنا بیٹھنا ، جنگ و صلح ، محبت و عداوت ، سب کچھ رضائے الٰہی کے تابع ۔ ہر عمل میں اس کی خوشنودی اور مرضی پیشِ نظر ۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں دیکھئے تو آپس میں رحیم ، کفار پر شدید ، جبینوں پر داغ ہائے سجدہ ، دلوں میں نورِ ایمان ، دماغوں میں اللہ کا نام بلند کرنے کا سودا ۔ سرتاپا اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ۔ حضورؐ نے نماز کو معراج المومنین کہہ کر معرفتِ الٰہی کا دروازہ ہر کلمہ گو پر کھول دیا اور اس طرح کہ یہ معرفت کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ استعداد والے لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل کرسکیں۔ جو شخص جس قدر نماز اور ذکرِ الٰہی کے اسرار سے واقف ہوگا اور جس قدر اس میں خضوع

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۔ اردو ترجمہ ص ۱۴۰ ۔

وخشوع سے کام لے گا، اسی درجے کی معرفت یا معراج اسے حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے مختلف اوقات میں مختلف اوراد واذکار کے اسرار بیان فرماکر حقیقی تصوّف کی طرف رہنمائی فرمادی۔ ظاہر ہے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے والا ہی معرفتِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے اور جو شخص حقوق العباد ادا نہیں کرسکتا اس سے یہ توقع کیونکر ہوسکتی ہے کہ وہ حقوق اللہ بطریقِ احسن ادا کرسکے گا۔ بقول شیخ سعدیؒ

تو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ بر آسمانت پرداختی

غرضیکہ شاہ صاحبؒ نے اسلامی تصوف کو یونانی، ہندی اور بدھ ازم کے غیر اسلامی اثرات سے پاک کرکے پیروانِ اسلام میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔ اور مسلمان جو اہل سیاست اور اہل مذہب، یا دنیادار اور دین دار کے دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ان کو اپنی تطبیق دینے کی حیرت انگیز صفت کام میں لاکر متحد کرنے کی سعیٔ بلیغ فرمائی۔

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی کے زمانے سے مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود نے خاصی شہرت حاصل کی اور اس سلسلے میں علماء کے درمیان کافی افتراق وانتشار رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی حیرت انگیز صلاحیتِ تطبیق کو کام میں لاکر انہیں باہم منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ان دونوں نظریوں کے درمیان کوئی معقول فرق نہیں۔ محض الفاظ کا اختلاف ہے۔ ورنہ ان کا مقصود ایک ہی ہے (یعنی وجود حقیقی کی وحدت اور یکتائی ثابت کرنا)۔ چنانچہ ابن عربی کے اس قول میں کہ ممکنات کے حقائق اس وجود منبسط کے نام اور صفات ہیں اور حضرت مجدد کے قول میں کہ ممکنات کے حقائق وہ عدمات ہیں جن پر اس وجود منبسط کے اسماء اور صفات کے انوار کا عکس پڑتا ہے، کوئی فرق نہیں۔ بس تعبیرات کا معمولی سا فرق[1] ہے اور اس فرق کی تعبیرات ممکن ہیں اور جب تعبیرات ممکن ہیں تو پھر خواہ مخواہ

---

[1] مکتوب مدنی، شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۱۳۷-۱۳۸۔

ملتِ اسلامیہ میں افتراق و انتشار کو کیوں راہ دی جائے ۔

پروفیسر ضیاء الدین صاحب رقم طراز ہیں :۔ شاہ صاحبؒ میں دین کے امور میں جو اس قدر وسعتِ نظر پائی جاتی ہے جس سے بڑھ کر وسعت کا تصوّر نہیں ہو سکتا۔ اس کا سِر وہ ایک مشاہدے میں یوں بیان فرماتے ہیں :۔

> میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلیٔ اعظم ظاہر ہوئی تو میں نے اُسے غیر متناہی پایا۔ اور اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا۔ میں نے دیکھا کہ گویا میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں اس غیر متناہی کو اپنے اندر نگل گیا ہوں ۔ اور میں نے اس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا ، اس کے بعد جو میں نے اپنے نفس کی طرف رجوع کیا تو کچھ دیر تک میں اپنے نفس کی اس وسعت و عظمت سے حیرت میں رہا لیکن پھر یہ حالت مجھ سے جاتی رہی[1]۔

یہی وسعتِ نظر ہمیں شاہ صاحب کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے دو بڑے گروہوں کے مخالف نظریات اور عقائد کو تطبیق دینے میں فرمائی ہے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے درمیان سب سے بڑا اور بنیادی مابہ النزاع مسئلہ افضلیت شیخینؓ اور فضیلت حضرت علیؓ کا ہے ۔ جہاں تک شاہ صاحبؒ کے ذاتی عقائد کا تعلق ہے ) اور ایک انہیں پر کیا موقوف ہر اہلِ دل کے لئے حضرت علیؓ کی شخصیت اپنے اندر حد درجہ کشش رکھتی ہے ۔ تمام صوفی شعرا بلکہ غیر صوفی شعرا بھی حضرت علیؓ سے اپنے کمالِ عقیدت کا اظہار کرتے آئے ہیں ۔ مثلاً مولانا روم فرماتے ہیں ؎

اے از ہمہ عصیاں بری، مردانِ عالم را سری      علم محمدؐ را دری مستاں سلامت میکنند
اندر سما نامت علی، اندر زمیں نامت ولی      در علمِ دیں تو کاملی مستاں سلامت میکنند[2]

---

[1] الرحیم مارچ ۶۵ء صـ۲۲ ۔
[2] کلیات شمس تبریز۔

اور ؎

اے واقفِ علم الیقیں اے کاشفِ عین الیقیں
اے صاحب حق الیقیں مستاں سلامت میکنند[1]

اہلِ دل حضرات میں شاہ صاحبؒ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں — جہاں تک علوم ولایت کا تعلق ہے تو اس میں بلاشبہ حضرت علیؓ سب سے افضل ہیں[2] — حضرت علیؓ حضور نبی کریمؐ اور اولیائے کرام کے مابین واسطہ ہیں[3]۔ لیکن اس وفورِ عقیدت کے باوجود انہوں نے جادۂ اعتدال سے سرِمو روگردانی نہیں کی۔

پروفیسر غلام حسین جلبانی رقمطراز ہیں:۔ شاہ صاحبؒ کا طبعی رجحان حضرت علیؓ کی افضلیت کی طرف تھا۔ مگر انہیں مکاشفے میں اس طبعی رجحان سے متأثر نہ ہونے کی ہدایت کی گئی۔ جس پر وہ کاملاً کاربند رہے۔

فرماتے ہیں:۔ شیخین کی افضلیت سے مراد یہ نہیں کہ وہ نسب، شجاعت، قوت اور معرفت میں حضرت علیؓ سے افضل تھے۔ بلکہ یہ کہ اُن کے ہاتھوں اسلام کو زیادہ نفع پہنچا اور یہی فضیلت سے مُراد ہے[4]۔

ایک اور موقع پر اس بات کو زیادہ واضح کرکے فرماتے ہیں:۔ وہ مقصدِ الٰہی جو حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں صورت پذیر ہوا تھا، وہ بالکل اسی صورت میں ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے کارناموں میں ظہور پذیر ہوا۔ یعنی منصبِ نبوت کی جتنی تکمیل ان دونوں بزرگوں کے ہاتھوں انجام پائی، وہی ان کی فضیلت کا باعث بنی۔

اس کے علاوہ دوسرے متنازعہ فیہ مسائل مثلاً ظہور مہدی اور بارہ اماموں یا خلفاء

---

[1] علاء الدین مخدوم علی احمد صابر پیران کلیر۔ [2] فیوض الحرمین مشہد ۲۲۔
[3] الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ [4] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۳۲۶۔
[5] التفہیمات جلد اول۔

والی حدیث کی وہ بڑے خوبصورت اور حقیقی پیرائے میں تاویل فرماتے ہیں جو تاریخی لحاظ سے بھی قابل قبول ہے اور عقلی لحاظ سے بھی۔ ائمہ اثنا عشری کے لئے وہ یہی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ملتِ اسلامیہ کے روحانی پیشوا اور امام تھے۔ فرماتے ہیں:۔ میں نے اہل بیت کے اماموں کی ارواحِ مقدسہ حظیرۃ القدس میں دیکھیں جو نہایت درجہ حسین وجمیل تھیں۔ چنانچہ مجھے یقین ہوگیا کہ ان کا منکر اور بدخواہ بڑے خطرے میں ہے۔ لیکن اُن کے چہرے باطن کی طرف پھرے ہوئے تھے[1]۔ اس طرح وہ ایک طرف اہل سنت پر اہل بیت اور حضرت علیؓ کی فضیلت ظاہر کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف اہل تشیع کو شیخین کی دینی خدمات کی طرف متوجہ کرکے اس میدان میں اُن کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ اور یوں بڑی عمدگی اور توازن کے ساتھ دونوں مخالف گروہوں کو باہم ملانے کی سعیٔ بلیغ فرماتے ہیں۔

مذاہب عالم کے بارے میں بھی اُن کا یہی خیال ہے کہ دین فی اصلہ ایک ہے اور شرائع کا اختلاف انسان کی نوعی استعداد کے باعث ہے اور تمام انبیاء کرام نے اسی ایک دین کی جانب اپنی اپنی قوموں کی ہدایت فرمائی ہے[2]۔

غرض بظاہر متضاد احکامات ہوں یا احادیث۔ نظریات ہوں یا عقائد۔ شاہ ولی اللہ صاحب انہیں باہم منطبق کرنے کی زبردست صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اُن کے قاری پر اُن کی یہ صلاحیت نہ صرف بہت جلد واضح ہوجاتی ہے بلکہ اس کو ان کی خوبی کا معترف بھی ہونا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب کے ایک شارح کی رائے ملاحظہ ہو:۔

اس حقیقت کی طرف بارہا اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اختلافات دور کرنے میں شاہ صاحبؒ کی ذات ایک امتیازی خوبی کی حامل تھی۔ اور ظاہری تضاد رفع کرکے ان میں مطابقت پیدا کرنے میں آپ کو یدِطولیٰ حاصل تھا[3]۔

---

[1] تفہیمات جلد اول ص ۱۰۷۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ الجزء الاول ص ۸۶ تا ۸۸۔

[3] شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۱۳۲۔